ثقافت
بشیر احمد ڈار

سقراط اور اس کا فلسفۂ اخلاق

(۳)

زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے اور حالت یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب دئے بغیر انسانی زندگی کا تمام سکون و چین ختم ہو جاتا ہے اور اس میں وہ مقصدیت پیدا نہیں ہوتی جو انسان کی روحانی زندگی کے صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ ایک آدمی طب کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو اس کی نگاہ میں اس کا مقصد زندگی مریضوں کی صحت کو بحال کرنا ہے لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کا تمام کام میکانکی بن کر رہ جاتا ہے کبھی اس کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کیا اس مریض کا علاج کرنا چاہئے یا کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اسے مرجانے دیا جائے؟ کئی دوسری چیزوں کے مقابلہ میں صحت یا خود زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے؟ نہ کبھی کسی کاروباری آدمی نے اپنے دل میں یہ سوال کیا کہ کیا مجھے اور دولت کمانا چاہئے؟ دولت کی کیا اہمیت ہے؟ اسی طرح ہم بے سمجھے بوجھے زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں۔ مختلف مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کئی قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں لیکن ان گوناگوں مقاصد کی صحیح قدر و قیمت کے تعین کے متعلق ہمارے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہی وہ سوال تھا جس کی طرف سقراط نے لوگوں کی توجہ دلائی۔ اس نے اپنے ہر ملنے والے کے قلب و ذہن میں اس مسئلے کو تازہ کر کے اور اس کی اہمیت جتا کر ایک عجب طرح کی کش مکش پیدا کر دی۔ لوگوں کے ذہن طبعی فلاسفہ کی بے معنی موشگافیوں اور سوفسطائی گروہ کی بے راہ روی سے پہلے سے بیزار تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ شاید سقراط بھی انہی لوگوں کی طرح ان کے روائتی اقدار کے تقدس کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے لیکن ان کا مقصد محض سلبی تھا اور سقراط کا مقصد ایجابی۔ وہ لوگوں کے ذہنوں سے قدیم روایات اور تصورات کے زنگ آلودہ پردوں کو ہٹا کر ان کی جگہ تلاشِ حق اور حقیقت طلبی کا جنوں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لوگ بلا سوچے سمجھے انہی عقاید و نظریات کو تسلیم کئے زندگی گذار رہے تھے جن پر انہوں نے اپنے آباو اجداد کو پایا تھا اور سقراط نے انہیں بُری طرح جھنجھوڑا کہ یہ طرزِ زندگی نہ صرف غلط بلکہ انسان کی روحانی نشوونما کے لئے مضرت بخش ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ ان تمام عقائد و نظریات کو عقل و فہم کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے کہ ان میں کتنی حقیقت ہے اور کس قدر باطل کی آمیزش۔ ہمارے کون سے مقاصد ہیں جو حقیقی طور پر قابلِ قدر اور قابلِ پیروی کہے جا سکتے ہیں۔ کیا کوئی ایک واحد نصب العین ہے جس کے حصول کے لئے ہمیں سرگرداں رہنا چاہئے؟ ایک کاروباری آدمی خود یہ تسلیم کرے گا کہ دولت اس کا آخری مقصد اور نصب العین نہیں بلکہ دولت کی تلاش کا مقصد یہ ہے کہ وہ سکون حاصل کر سکے۔

اسی طرح ایک طبیب کے نزدیک صحت کا مقصد بھی اس سکون کا حصول ہے۔ اس طرح گویا سکون ایک ایسا نصب العین محسوس ہوتا ہے جو مختلف آدمی اپنی زندگی میں حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سکون کیا چیز ہے؟ اس کی تین مختلف توجیحات کی جاسکتی ہیں (۱) خوشی (۲) معاشرتی کامیابی، عزت اور شہرت (۳) علم و حکمت۔ ان ہی تین سمتوں میں سکون کی تشریح کی جاتی رہی ہے۔ کیا ان میں سے کوئی ایک تنہا سکون و تسکین کا باعث ہوسکتا ہے؟ اور اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو وہ کیا چیز ہے؟ کیا یہ سبھی ایک مکمل زندگی کے لازمی اجزا ہیں؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو ان کو کس نسبت میں اختیار کیا جانا چاہیئے؟ سقراط نے ان تمام سوالوں کا جواب یہ دیا کہ صحیح تسکین روح کی تکمیل میں مضمر ہے جس کو اپالوجی میں اس نے یوں ادا کیا: ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی روحوں کو ایسا نیک بنائیں جتنا ممکن ہو۔ اس کے علاوہ تمام مقاصد لغو اور بے معنی ہیں۔ اگر ان کی کوئی قدر و قیمت ہے تو وہ محض اس بلند مقصد کے حصول کے ذرائع کی حیثیت سے ہوسکتی ہے۔ اس روحانی زندگی کے لئے گہری بصیرت کی ضرورت ہے، محض آباؤ اجداد کی تقلید سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہی وہ گہری بصیرت ہے جس کو سقراط نے علم کا نام دیا اور جو اس کے مشہور مقولہ میں مندرج ہے کہ نیکی علم ہے اور بدی جہالت۔

اس مشہور سقراطی نظریئے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اخلاقی عمل کے دونوں اجزاء کو سامنے رکھا جائے۔ ہر اخلاقی فعل میں دو مختلف نفسیاتی تجربات شامل ہوتے ہیں۔ ایک کو ہم علم یا بصیرت کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو ارادی قوت۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کو معلوم ہو کہ اس کا فرض کیا ہے اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے کے لئے وہ قوتِ ارادی کو حرکت دیتا ہے۔ ان دونوں اجزاء کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ انسان کی زندگی میں کئی بار ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ دو بالکل متضاد ذمہ داریاں اس کے سامنے ہوتی ہیں اور اسے ان میں سے ایک کو اختیار کرنا اور دوسرے کو رد کرنا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ ایک فرد کے لئے ان میں کسی ایک کو اختیار کرنے اور دوسرے کو رد کرنے کا فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک کشتی میں ایک آدمی، اس کی بیوی اور اس کی والدہ موجود ہیں اور حالات ایسے نازک ہو چکے ہیں کہ بیوی اور والدہ میں سے وہ صرف کسی ایک کو بچا سکنے پر قادر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرے؟ والدہ اور بیوی دونوں کی حفاظت اور دونوں سے محبت کے تقاضے تقریباً مساوی ہیں۔ اسے دونوں کی جان بچانی چاہیئے۔ لیکن اس نازک موقع پر اسے ان دونوں میں سے ایک کو منتخب کرنا ہے۔ اس کا فرض کیا ہے؟ دنیا کے بلند ترین المیے ایسے ہی متضاد تقاضوں میں کسی آدمی کے الجھ کر رہ جانے سے پیدا ہوئے ہیں۔ ارسطو کے قول کے مطابق الم ناک واقعہ کا باعث یہ نہیں کہ ایک کمزور فطرت کا انسان اپنے فرض کو پہچانتے ہوئے لالچ، شہوت یا شہرت کے جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے بلکہ اس کا صحیح اظہار اس وقت ہوتا ہے جب ایک مضبوط ارادے والا انسان دو متضاد فرائض کی کش مکش میں اتنا گرفتار ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ کر نہیں پاتا۔ وہ شدت سے محسوس کرتا ہے کہ اسے ان دونوں فرائض کو ادا کرنا چاہیئے اور وہ ہمہ تن تیار ہے کہ جو کچھ اسے کرنا چاہیئے وہ اسے کر ڈالے، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے حق میں

ملی وجہ البصیرت فیصلہ نہیں کر سکتا اور حالات کی مجبوری اسے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف مائل کرتے چلی جاتی ہے۔ اسی کش مکش کی حالت میں وہ ایسا فیصلہ کر لیتا ہے جس کے نتائج اس کے حق میں اچھے نہیں ہوتے۔ سب المیوں میں اسی بصیرت کا فقدان نظر آتا ہے۔ آدمی اپنے فرض کو پورا کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ ایک خاص موقعہ میں کون سا عمل اس کے لئے فرض کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام واقعات جو اوپر بیان کئے گئے اپنے اندر ایک انتہائی شدت لئے ہوئے ہیں اور مفکرین نے ان کو پیش اس لئے کیا ہے تاکہ دو مختلف اخلاقی اصولوں کے تصادم کی نوعیت کی وضاحت ہو سکے۔ ویسے یہ کش مکش ہر اخلاقی عمل میں موجود ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ اور یہودی علماء میں جو نزاع پیدا ہوئی وہ دراصل اسی بصیرت کی کمی کی وجہ سے تھی۔ یہودی علماء اخلاقی اور مذہبی قوانین کی پابندی تقلیداً کیا کرتے تھے جس سے ان قوانین کی روح مجروح ہوتی تھی اور حضرت عیسیٰ اسی بنا پر ان کو مورد لعن وطعن بناتے تھے۔ سبت کے دن یہودی عام تعطیل مناتے تھے اور کوئی کام کرنا بُرا سمجھتے تھے۔ اس دن حضرت عیسیٰ نے ایک بیمار عورت کو اچھا کر دیا۔ اس پر تمام یہودی علماء نے حضرت عیسیٰ کو حرمت سبت کو توڑنے کا مجرم گردانا۔ لیکن اُنہوں نے جواب دیا کہ سبت کے دن کی حرمت کا یہ مفہوم کبھی نہیں ہو سکتا کہ نیکی اور رحم کے کاموں سے بھی ہاتھ روک لیا جائے۔ نیکی اور بھلائی کا قانون سبت کے دن کے قانون سے بالا اور افضل ہے۔ اسی طرح سزا اور عفو کے دونوں قوانین ہیں لیکن بعض وقت عدالت کا تقاضا سزا ہوتا ہے اور بعض دفعہ عفو۔ اس کا فیصلہ کہ کونسا قانونِ اخلاق کس وقت مرجح ہے درحقیقت عقل وبصیرت پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے بار بار علم وعقل کے استعمال پر زور دیا ہے اور منکرینِ حق کو بصیرت سے محرومی کا الزام دیا ہے:

وما یتبع اکثرھم الا ظنّا۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔ (۱۰: ۳۶)

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس وگمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں حالانکہ گمان کسی کو علمِ حق کی ضرورت سے مستغنی نہیں کر سکتا

مشرکین کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا:

قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا۔ ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون (۶: ۱۴۸)

ان سے کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان پر چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کر رہے ہو۔

اسی طرح جب لوگ اخلاقی اصولوں کے معاملے میں بجائے عقل وبصیرت کے روایات اور قدیم عقائد کی تقلید کو ترجیح دیتے ہیں تو قرآن ان کے اس طرزِ عمل پر تنقید کرتا ہے کہ اس تقلید سے کوئی فائدہ نہیں۔ اخلاقی عمل کی صحیح قدر وقیمت صرف اسی وقت مترتب ہوتی ہے جب اس میں عقل وبصیرت سے کام لیا جائے:

واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے

والی الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ آباءنا۔ اولو کان آباؤھم لا یعلمون شیئا ولا یھتدون۔

نازل کیا ہے اور پیغمبر کی طرف آؤ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لئے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا کی تقلید کئے چلے جائیں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستے کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟

قرآن میں ایک جگہ اس چیز کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ صحیح خیر و نیکی، سعادت و سکون کی اصلی بنیاد علم ہی ہے۔ جس کے پاس علم و بصیرت نہیں اس سے خیر و تقویٰ کی توقع نہیں کی جا سکتی گویا نیکی علم میں مضمر ہے اور جہاں کہیں علم موجود نہیں وہاں تقوے، نیکی اور خیر کا فقدان ہونا اغلب ہوگا۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤا۔ (۳۵: ۲۸) یقیناً اللہ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم کے حامل ہیں۔

اس علمی اور بصیرتی پہلو کے ساتھ ساتھ ارادی پہلو بھی ہے انسان محض علم و عقل نہیں اس میں جذبات اور خواہشات بھی ہیں۔ اکثر حالات میں انسان اخلاقی فرض کو محسوس کرتے ہوئے بھی اپنی خواہشات کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن نے انسان کی فطرت کے متعلق یہ کہہ کر کہ:

فطرت اللہ التی فطرت الناس علیھا۔ (روم ۳۰: ۳۰) انسان کی فطرت اللہ کی فطرت پر بنائی گئی ہے۔

ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ہم نے یقیناً انسان کو اچھی فطرت پر پیدا کیا۔

اس حقیقت کا اعلان تو کر دیا کہ انسان فطرتاً بدی کی طرف رجحان نہیں رکھتا اور اگر اس کے لئے مناسب ماحول اور تربیت کا خیال رکھا جائے تو قوی امکان ہے کہ وہ راست روی اختیار کرے۔ لیکن خواہشات اور جذبات کا وجود انسان کی اخلاقی زندگی میں ایک قسم کی کمزوری پیدا کرتا ہے اور اسی کمزوری کو رفع کرنا اخلاقی تعلیم و تربیت کا کام ہے۔ قرآن نے کئی جگہ خواہشات کی پیروی سے منع کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس چیز کا اعلان بھی کچھ اہم نہیں کہ خواہشات کی پیروی کرنے والے عام طور پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو علم میں کم مایہ ہوتے ہیں۔

ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔ (۴۵: ۱۸) ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر جو علم سے محروم ہیں۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ، ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون۔ (۶: ۱۱۶) اے محمد! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دینگے، وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

وان کثیراً لیضلون باھوائھم بغیر علم۔ (۶: ۱۱۸) بکثرت لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم کے بغیر اپنی خواہشات کی بنا پر گمراہ کن باتیں کرتے ہیں۔

ان تمام آیات میں اس چیز کی وضاحت کی گئی ہے کہ زندگی کی اکثر گمراہیاں زیادہ تر علم کی بجائے گمان و قیاس

کی پیروی سے پیدا ہوتی ہیں اور سقراط کی تمام زندگی کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کے ذہنوں میں بہادری، عدالت، رحم، خدمت خلق وغیرہ اخلاقی اعمال کے جو مغالطے اور غلط تصوّرات قائم ہیں ان کو دور کرکے ان کی جگہ صحیح تصورات قائم ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر صحیح علم کسی کے پاس ہو تو اس کی بنا پر اخلاقی اعمال کی عمارت استوار کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ سوفسطائیوں کے نزدیک اخلاقی اقدار وقتی، عارضی اور موضوعی ہیں اور ایک شخص کی خوشی یا راحت دوسرے شخص کی خوشی اور راحت نہیں ہو سکتی۔ سقراط نے اس تمام جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے یہ اعلان کیا کہ یہ تمام بے کار مباحث اور جھگڑے محض اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ہمیں مختلف اخلاقی اقدار کا صحیح علم نہیں۔ اگر محض گمان اور قیاس آرائیوں کو چھوڑ کر صحیح علم حاصل کیا جائے تو انسانی زندگی کی بے راہ روی اور ٹھوکروں سے بچنے کا سامان مہیا کیا جا سکتا ہے۔ سوفسطائیوں کی منطقی موشگافیوں سے اس زمانے کی اخلاقی زندگی میں جو خلا پیدا ہو چکا تھا اس کو پُر کرنے کے لئے سقراط نے لوگوں کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا کہ علم ہی خیر کا منبع ہے۔ ہر شخص اپنی بھلائی اور خیر کا طالب ہے اور ہر شخص یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ عدالت اور نیکی تمام اخلاقی اقدار میں بہترین خیر ہیں۔ ان دو مفروضات کو تسلیم کرنے کے بعد یہ ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ لوگ جو عدالت اور نیکی کے صحیح تصوّرات سے واقف ہیں، ان کے لئے ان سے بچ کر کوئی اور کام کرنا ممکن نہیں۔

سقراط کا یہ نقطہ نگاہ سمجھنے کے لئے نظریہ لذتیت (Hedonism) کی ایک مختصر سی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس نظریے کی رُو سے انسان کے تمام اعمال کا اصلی محرک اس کی خواہش حصولِ لذّت ہے۔ ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کی قربانی کرکے دوسروں کو خوش کرنے یا فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی اصلی وجہ اس نظریے کی رو سے یہ ہے کہ اس بالواسطہ طریقے سے وہ زیادہ راحت و لذّت حاصل کرتا ہے کیونکہ ایسے عمل سے معاشرے میں اس کی نیک اعمالی کی وجہ سے شہرت ہوتی ہے۔ ایک شخص چند اصولوں کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ہٹ اور ضد پر اڑے رہنے، دشمنوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار پر قائم رہ کر، لوگوں کی نگاہ میں محترم و معزز ہونے کے خیال سے ایک ایسی لذّت حاصل کر سکتا ہے جو برعکس حالت میں اس کے لئے ممکن نہیں۔ یا اس کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کو اپنے بنیادی عقاید اور اصولوں کی مسلسل پیروی میں زیادہ لذّت ملتی ہے بجائے ان کی خلاف ورزی کے۔ ابراہیم لنکن کے متعلق ایک مشہور واقعہ ہے جس کا ذکر اخلاق کی کتابوں میں عام طور پر کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ راستہ چلتے ہوئے اس نے ایک چھوٹے سے جانور کو کسی گڑھے میں گرا ہوا پایا جہاں سے وہ باوجود انتہائی کوشش کے باہر نہ نکل سکا۔ لنکن اس کے پاس سے گزر گیا۔ لیکن تھوڑی دور جا کر واپس مُڑا اور گڑھے میں سے جانور نکال کر چھوڑ دیا۔ لوگوں نے لنکن کا یہ ہمدردانہ رویّہ دیکھ کر اس کی تعریف کی لیکن اس نے جواب دیا کہ اس کا یہ فعل درحقیقت کسی تعریف کے قابل نہیں کیونکہ اس کا اصلی محرک جانور کی ہمدردی نہیں بلکہ اپنی داخلی اور حسّی تکلیف کو رفع کرنا تھا جو اس کے دل میں اس جانور کی تکلیف و بے چارگی کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ ان تمام توجیہات سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ انسانوں کے تمام افعال کا اصلی محرک حصول لذّت یا ترک تکلیف ہے۔ یہ بہت ممکن

ہے کہ دو مختلف راستوں میں سے جو راستہ ہم اختیار کریں وہ بعد میں لذت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کا باعث ہو لیکن یہ افسوسناک نتیجہ ہمارے اپنے غلط اجتہادی فیصلے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ اس لئے کہ ہم نے عمداً اس راستے اور طریقے کو تکلیف اُٹھانے کے لئے اختیار کیا تھا۔ عملاً ہم میں سے اکثر لوگوں کو اپنے علم کی کمی یا فیصلے کی غلطی کے باعث ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم اور ناقابلِ تردید ہے کہ جو فیصلہ ہم کرتے ہیں اور جو قدم ہم اُٹھاتے ہیں اس کا اصلی اور بنیادی محرک یہی جذبہ ہوتا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لذت و راحت حاصل کر سکیں۔ یہی نقطۂ نگاہ سقراط کا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسانوں کی فطرت کی تعمیر کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ خیر و نیکی کے طالب ہوتے ہیں اور کوئی شخص جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر بدی کو بدی سمجھ کر اس کا خواہاں نہیں ہوتا جس طرح نظریۂ لذتیت کے حامیوں کا کہنا ہے کہ ہر شخص لذت و راحت کی طلب کرتا ہے اور اگر اس کے باوجود وہ کبھی کبھار مضرت و تکلیف حاصل کرتا ہے تو یہ محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس نے دو مختلف راستوں میں سے کسی ایک کے انتخاب میں غلطی کی بالکل اسی طرح سقراط کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وقت بدی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ اس کو بدی سمجھتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے اس اقدام کو نیکی سمجھا حالانکہ وہ ایسا نہ تھا۔ یعنی ہر وہ قدم جو انسان بدی اور شر کی طرف اُٹھاتا ہے درحقیقت فقدانِ علم کا نتیجہ ہے۔

افلاطون کے مختلف مکالمات میں سقراط نے مختلف نیک اعمال کا تجزیہ کیا ہے۔ مثلاً لیچز (Laches) میں شجاعت و دلیری پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ہر انسان میں خواہ وہ بزدل ہو یا دلیر خوف کا جبلّی جذبہ موجود ہے۔ اس کے باوجود دونو میں فرق صرف یہ ہے کہ دلیر آدمی جانتا ہے کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جن سے اسے حقیقی طور پر ڈرنا چاہیئے اور بزدل اس علم سے جاہل ہوتا ہے۔ لیکن خوف ایک ایسا تجربہ ہے جس کا تعلق مستقبل سے ہے اس لئے خوف کھانے والی چیزوں کا علم مستقبل کا علم ہوا۔ مگر آئندہ ہونے والے خیر و شر کا علم موجودہ خیر و شر کے علم سے بے نیاز یا علیحدہ نہیں ہو سکتا اس لئے دلیری گویا تمام خیر و شر کے علم کا ایک جزو ہوا اور اس لئے جو شخص حقیقی معنوں میں دلیر ہوگا وہ گویا دوسری نیکیوں سے بھی اسی طرح واقف ہوگا یعنی تمام نیکیاں درحقیقت ایک ہی سرچشمہ سے نکلتی ہیں[1]۔ اسی حقیقت کو قرآنی اصطلاح میں تقوےٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تقوےٰ کسی خارجی ہیئت یا طرزِ معاشرت کا نام نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت اور نفسی رجحان ہے۔ جو احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتا ہے۔ جس شخص کے دل میں تقوےٰ پیدا ہو جائے تو گویا اس کے قلب میں ایک ایسے بیج کا پودا لگ گیا جس کے برگ و بار سے ہر طرح کی نیکیاں اور خیر اور بھلائی کے اعمال خود بخود نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ صحیح متقی انسان وہ ہے جس کا ہر عمل اور ہر قول اخلاقی اصولوں کے مطابق ظہور پذیر ہو۔ یعنی وہ چیز جس کو سقراط علم کا نام دیتا ہے وہی قرآنی اصطلاح میں تقوےٰ ہے۔ ایک دوسرے مکالمے چارمائیڈز میں سقراط نے جذبۂ اعتدال (Temperance) پر بحث کی ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ہم انسانی خواہشات اور جذبات کو

---

[1] دیکھئے جوویٹ کی کتاب جلد چہارم مکالمہ لیچز کی تمہید صفحہ ۸۵

پوری آزادی دیدیں یا ان کو کلیتہً دبانے اور مٹا دینے کی کوشش کریں۔ صحیح اعتدال یہ ہے کہ ایک خاص اصول اخلاق تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں جبلّی خواہشات اور تقاضوں کو پورا کرنے کا ایک درمیانی راستہ معلوم کیا جا سکتا ہے جس سے انسان کی مجموعی اخلاقی اور روحانی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اعتدال گویا اصولِ اخلاق کا علم ہے۔ جس کو یہ علم حاصل ہے وہ اخلاقی کردار کا بہترین حامل ہوگا اور جو شخص اس سے ناواقف ہے اس سے اخلاقی عمل کی توقع بے کار ہے۔

عام طور پر سقراطی علم کو محض استدلالی اور منطقی علم کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس بنا پر اس کے نظریئے پر مختلف زاویوں سے اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً انسانی زندگی محض علم نہیں بلکہ اس میں جذبات اور ارادہ بھی موجود ہیں جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ہر اخلاقی فعل دو مختلف اجزا سے مرکب ہوتا ہے، ایک علم اور دوسرے قوتِ ارادی۔ سقراط نے علم کی اہمیت کو محسوس تو کیا لیکن قوت ارادی کی ضرورت سے غافل رہا۔ عام طور پر ایک شخص بھلائی اور نیکی کو محسوس کرتے ہوئے بھی بدی کی طرف راغب ہوتا ہے اور غلط قدم اُٹھانے پر جب اسے ملامت کی جاتی ہے تو اپنی نفسیاتی کمزوری کا عذر پیش کرتا ہے:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالب کا یہ شعر سقراط کے نظریئے کی اس توجیہ پر بہترین تنقید ہے۔ اس کے علاوہ اگر سقراط کی تشریح کو تسلیم کیا جائے تو تمام نیکیاں مختلف النوع نہیں ہونگی بلکہ ایک ہی بنیادی نیکی کی مختلف شاخیں قرار پائیں گی۔ مثلاً جس شخص کو خیر اور شر کا علم ہوگا وہ شجاع، عادل، سخی، دانا سبھی کچھ ہوگا حالانکہ عملی دنیا میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص شجاع تو ہے لیکن حکمت و دانائی سے اسے کچھ بہرہ نہیں ملا۔ ایک شخص سخی ہوتے ہوئے بھی لذّت و شہوات میں مبتلا ہے۔ سقراط کے نظریئے کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے عملی زندگی کا یہ تضاد کسی طرح حل نہیں ہو پاتا۔

لیکن اگر سقراطی علم کو استدلالی علم کی بجائے ذوقی علم سمجھا جائے تو ان مختلف اعتراضات کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ علم ایک خالص عقلی فعل ہے جس میں عملی کردار اور جذباتی پہلو شامل نہیں۔ لیکن وہ علم جس کو ہم نے یہاں ذوقی علم کا نام دیا ہے اس میں انسانی زندگی کے تمام پہلو منعکس ہوتے ہیں اس میں عقلیت کے ساتھ ساتھ جذبات اور ان دونوں کا اظہار عمل کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی وسیع تر علم کو ہم اقبال اور رومی کی زبان میں عشق و جنون و جذب کہہ سکتے ہیں جس میں علم بھی ہے اور عمل بھی، عقل بھی ہے اور جذبِ اندرونی بھی محض استدلالی علم انسان کی راہنمائی کرنے سے عاجز ہے لیکن اگر اس علم میں نگاہِ شوق شامل ہو جائے تو یہ علم نفسیاتی زندگی تو کیا ساری کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں　　نگاہِ شوق اگر ہو شریک بینائی

اگر ایسی عقل میسر آجائے جو ادب خوردہ دل ہو تو ایسی جذب آمیز عقل یقیناً انسانی راہنمائی کے لئے کافی ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو سقراط نے اخلاقی زندگی کا محور و بنیاد قرار دیا۔ ایسے ہی علم کے حامل کے لئے متقی کا لفظ موزوں ہوگا۔ اگر سقراط کی اپنی زندگی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ علم و تقوے کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اس کے دل میں خدا کا خوف،

اپنی ذمہ واری اور جواب دہی کا احساس پوری شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے قلب و زبان پر یہ ادراک موجود تھا کہ اس دنیا کی زندگی ایک مختصر سی مہلت ہے جس کے بعد ایک ابدی زندگی ہے جہاں اس کے تمام اعمال کے نیک و بد کا فیصلہ ہونے والا ہے، جہاں اس کی تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اس احساس و شعور نے اس کے ضمیر کو اتنا بیدار کر دیا تھا کہ اس سے کسی قسم کی بُرائی سرزد ہونے کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ اس نے موت کو خوش آمدید کہنا بہتر سمجھا بجائے اس کے کہ وہ اپنے فرض میں کوتاہی برتے۔ اس کے نزدیک جیل خانے سے بھاگ کر اپنی جان بچانے کی کوشش ایسی ہی بداخلاقی کا فعل تھا جیسے کہ کسی نے گویا دوسرے کو ناحق جان سے مار ڈالا ہو۔ اس کی عقلی حِس اتنی تیز تھی کہ کسی محاسب کی غیر موجودگی میں بھی اس سے کوئی بداخلاقی کا فعل ظہور پذیر ہونا ممکن نہ تھا۔ تقوے کی یہ کیفیت اس کے پورے طرزِ فکر اور اس کی تمام زندگی میں جاری و ساری تھی اور اسی کے اثر سے اس میں ایسی ہموار و یکرنگ سیرت پیدا ہوئی کہ جو آج بھی صدیوں کے بعد دنیا سے خراجِ عقیدت وصول کرتی ہے۔ بدقسمتی سے مغربی حکماء نے سقراطی علم سے مراد محض عقلی علم لیا اور اس طرح اس کی اخلاقیات کی روحانی بنیاد صحیح معنوں میں دنیا کے سامنے نہ آسکی۔ اس نے سوفسطائی نظریۂ اضافیت اخلاق کی جگہ مستقل اور ہمہ گیر اخلاقی اصول وضع کئے اور ان کی اہمیّت کو اُجاگر کر کے انسانی معاشرے کی ابدی بہبود و خرد کی زندگی میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

جہاں کہیں قرآن میں صاحبانِ علم کی تعریف موجود ہے اس سے مراد علم استدلالی نہیں بلکہ وہی ذوقی و وجدانی علم ہے جس میں عقل و جذبات، علم و عشق کی پوری پوری آمیزش ہو چکی ہو۔ آل عمران میں ایک جگہ خدا نے اپنی توحید کی شہادت کے لئے تین ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ خود خدا، فرشتے اور صاحبانِ علم۔

شھد اللّٰہ انہ لا الٰہ الا ھو، والملٰئکۃ واولوا لعلم قائمًا بالقسط لا الٰہ الا ھوالعزیز الحکیم۔ (۱۸:۳)

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور فرشتے اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔

اس جگہ جن اولوالعلم لوگوں کا ذکر ہے ان کی تعریف "قائم بالقسط" سے کی گئی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے متقی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے نورِ علم کی روشنی میں خیر و شر، نیک و بد کے امتیازات کو جان کر اپنی زندگیوں کو اس نہج پر ڈال دیا ہے کہ ان کے لئے کسی ایک نیک عمل کا وجود انفرادی نہیں رہتا بلکہ ایک ہی سرچشمۂ خیر کا عکس ہوتا ہے، جن کی زندگیوں میں کسی قسم کے تضاد کی کوئی گنجائش نہیں، جن کے لئے نیکی اور بدی کا معیار خارجی نہیں رہتا بلکہ ان کے قلب و جگر کی گہرائیوں سے خود بخود اُبھر آتا ہے۔

انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء (۲۸:۳۵) خدا سے وہی لوگ ڈرتے ہیں یعنی متقی لوگ وہی ہیں جو علم کے حامل ہیں

قرآن کی اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ علم سے مراد تقویٰ ہی ہے یعنی صحیح تقوے اور نیکی و سعادت ہی علم ہے اور

یہی وہ علم ہے جس کو سقراط نے تمام اخلاقی زندگی کی بنیاد قرار دیا۔ جاوید نامہ میں اقبال نے اس نقطہ نگاہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور دونوں قسم کے علموں کی توضیح اور امتیاز کو پیش کیا ہے:

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است ۔ پیش چشم ما حجاب اکبر است
علم را مقصود اگر باشد نظر ۔ می شود ہم جادہ و ہم راہ بر
می نہد پیش تو از قشر وجود ۔ تا تو پرسی چیست سازِ این نمود
جادہ را ہموار سازد این چنین ۔ شوق را بیدار سازد این چنین
درد و داغ و تاب و تب بخشد ترا ۔ گریہ ہائے نیم شب بخشد ترا
علم تفسیر جہانِ رنگ و بو ۔ دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
بر مقام جذب و شوق آرد ترا ۔ باز چون جبریل بگذارد ترا

فکرِ اقبال

(از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم)

یہ بلند پایہ تصنیف اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے جس میں حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فلسفہ کے ہر پہلو کی دلنشیں اور حکیمانہ انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ قیمت دس روپے۔

افکارِ غالب

(مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم)

اردو ادب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس میں غالب کے ان فارسی اور اردو اشعار کی شرح کی گئی ہو جو بلند پایہ فلسفیانہ اور حکیمانہ مطالب کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے افکارِ غالب میں غالبؔ کے فلسفیانہ کلام کی حکیمانہ تشریح کر کے اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ: منیجر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور